ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

CC BY NC

ڈاکٹر زینت امان
پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اردو ادب اور معاشرتی اقدار کا زوال: اکیسویں صدی کے تناظر میں

Dr Zeenat Aman *
PhD, Department of Urdu, NUML, Islamabad.
***Corresponding Author:**

The Decline of Urdu Literature and Societal Values: In the Context of the 21st Century

This Article presents a critical analysis of the profound organic relationship between Urdu fiction and societal values. Literature and society are interdependent, with the writer serving as a mirror to the collective conscience and moral fluctuations of their time. This research employs the character dynamics in contemporary Urdu novels such as Najeeb, Rukhsana, Javed, Zarina, Mohsin, and Gul Meena as case studies to highlight the socio-moral factors threatening the sanctity of family systems, human relationships, and social integrity.The paper demonstrates that when materialism, greed for property, and ostentation overshadow higher values such as the sanctity of life and altruism, society inevitably suffers from moral bankruptcy. The study concludes that the decline of these literary characters is not merely a personal failure; rather, it reflects a transforming social structure where virtues like modesty, fear of God (Khauf-e-Khuda), and benevolence are gradually eroding. This paper emphasizes that the fundamental role of literature is not just to depict societal decay, but to confront society with its inner malaise and steer it toward moral reformation.

Key Words: *Urdu Fiction, Socio-Moral Values, Moral Decay, Materialism, Family Structure, Sanctity of Human Relationships, Contemporary Consciousness.*

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ادب اور معاشرہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، ادیب اپنے گرد و پیش کے حالات، معاشرتی دکھ سکھ اور تہذیبی اقدار کو اپنے لفظوں میں ڈھال کر ان کی عکاسی کرتا ہے۔ اگرچہ ہر تحریر میں ادیب کے اپنے جذبات اور مشاہدات شامل ہوتے ہیں، لیکن یہ احساسات بھی دراصل اسی ماحول اور سماجی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں جن میں وہ سانس لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی اور معاشرتی رویے ہی ادب کی تخلیق کا اصل محرک بنتے ہیں۔ اسی گہرے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے راجہ شکیل انجم رقمطراز ہیں:

"جب آدمی کو تخلیق کیا گیا تو ادب اور زندگی ساتھ ساتھ تھے۔ گویا ادب زندگی ہے اور زندگی ہی ادب۔۔۔ کیوں کہ ہر تخلیق زندگی کی علامت ہے اور زندگی ہی در حقیقت تخلیق ہے۔"(۱)

ادب کو اگر انسانی جذبات و احساسات کی تخلیق قرار دیا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ یہ جذبے کسی خلا میں پیدا نہیں ہوتے، بلکہ ان کا خمیر اسی معاشرے اور گرد و پیش سے اٹھتا ہے جس میں انسان سانس لیتا ہے۔ ایک حساس ادیب محض اپنی ذات کی بات نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے عہد کے اجتماعی ضمیر کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں کبھی لکھنوی معاشرت کی رنگینیاں اور عیش و عشرت نظر آتی ہے، تو کبھی نظیر اکبر آبادی کے ہاں مفلسی کے وہ تلخ رنگ دکھائی دیتے ہیں جو معاشرتی زوال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو، چاہے وہ قدیم داستانوں کی خیالی دنیا ہو یا شاعری میں گل و بلبل کے روایتی استعارے ان سب کا رشتہ بالآخر انسانی زندگی، حسنِ فطرت اور خیر و شر کی کشمکش سے ہی جڑا ہوتا ہے۔ اردو ادب کی پوری تاریخ، خاص طور پر قیامِ پاکستان اور ہجرت کے واقعات، اس بات کا ثبوت ہیں کہ ادیب کا قلم ہمیشہ اپنے عہد کے حالات کا پابند رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک توانا اور صحت مند معاشرہ ہی معیاری ادب کو جنم دیتا ہے، جبکہ بیمار معاشرتی رویے ادب میں بھی اضمحلال پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح، ادب ہی وہ واسطہ ہے جس کے ذریعے ایک عہد کے تجربات، مشاہدات اور فکری ورثہ اگلی نسلوں تک منتقل ہوتا ہے۔ ایک ادیب دراصل ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پُل کا کردار ادا کرتا ہے، جو گزرے ہوئے وقت کی دانائی کو آنے والے زمانوں کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔ اسی اہم فریضے کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے:

"میرے لیے عصری آگہی کا سب سے بڑا ذریعہ ادب ہے۔۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ لفظ ایک نسل کے تجربہ کو دوسری نسل تک منتقل کرنے کا پل بنتا ہے۔" (۲)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

یہ بات مسلمہ ہے کہ ادب اور معاشرہ دو طرفہ اثرات کے حامل ہیں۔ جہاں ادیب اپنے معاشرے کے نبض شناس کے طور پر حالات کو الفاظ کا روپ دیتا ہے، وہیں وہ خود بھی معاشرتی فکر و عمل کی سمت متعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ کئی بار ادیب اپنے دور سے آگے کی بات کہتا ہے، جسے وقت گزرنے کے ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پس، ایک باشعور ادیب محض 'کیا' پر نہیں، بلکہ اپنے کلام کے 'کیوں' اور 'کس لیے' پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ادیب نے ہمیشہ اپنے عہد کے تقاضوں کو نبھایا ہے۔ میر تقی میر اور میر درد کے کلام میں اٹھارویں صدی کے سیاسی انتشار اور سماجی بے ثباتی کا عکس موجود ہے، تو سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے زوال پذیر معاشرے میں بیداری کی نئی روح پھونکی۔ مولانا حالی کی 'مسدس' ہو یا مولوی نذیر احمد کے اصلاحی ناول، اکبر الہ آبادی کا طنز ہو یا علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی ان تمام قلم کاروں نے مایوس دلوں کو حوصلہ دیا اور فرسودہ سماجی ڈھانچوں کے خلاف آواز بلند کی۔ تقسیمِ ہند کے انسانیت سوز ہنگاموں کے دوران بھی ادب ہی اُس آئینے کے مانند تھا جس نے سفاکیت کے چہروں کو بے نقاب کیا اور انسانیت کو غیرت دلائی۔ غرض، ہر دور میں ادیب اپنے معاشرے کا نمائندہ بن کر تاریخ کے اوراق میں زندہ رہا ہے۔ اسی گہرے باہمی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے خاور جمیل لکھتے ہیں:

> "ادب برائے ادب کے نظریے کو مہمل سمجھتا ہوں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ادب برائے ادب کا نظریہ ادب کو اس کی بنیادی قوت یعنی سماجی عمل سے کاٹ دیتا ہے۔ کوئی ادب سماجی عمل سے کٹ کر، زندگی سے دور ہو کر، انسانی رشتوں سے بے تعلق ہو کر، عوام کو نظر انداز کر کے اور کسی ایک طبقے کے مفاد سے وابستہ ہو کر زندہ تخلیق عمل نہیں بن سکتا۔"(۳)

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور نے اپنے ساتھ نئے چیلنجز جنم دیے۔ چاہے عالمی سطح پر امن و امان کی مخدوش صورتحال ہو، جدید مشینی دور کے انسانی نفسیات پر منفی اثرات، خاندانی نظام کا بکھراؤ، جاگیردارانہ و قبائلی نظام کی جکڑ بندیاں ہوں یا غربت اور قومی تشخص کے بحران یہ سب وہ تلخ حقائق ہیں جن سے کسی ادیب کا دامن بچا کر گزرنا ممکن نہیں۔ ایک باشعور ادیب ان مسائل کو نظر انداز کر کے کسی الگ یا مصنوعی دنیا کا ادب تخلیق کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ درحقیقت، ادیب اسی مٹی اور اسی دھرتی کے دکھوں کا امین ہوتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری ان مسائل اور ادب کے باہمی تعلق کی بابت لکھتے ہیں:

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN(P): 2709-9636 | ISSN(O): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

"ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا۔۔۔ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیت اجتماعی، ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے۔ جس طرح کہ کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات و سکنات۔۔۔اس کے اندر کی دنیا اُس کے باہر کی دنیا سے متاثر ہو کر لکھتی ہے۔ اگر کوئی ادب اپنے ملک کی تازہ ترین حالات و فکریات کا حامل نہیں تو ہم اُسے اچھا ادب نہیں کہہ سکتے۔"(۴)

دراصل، وہی ادب امر اور لازوال ہوتا ہے جس کی جڑیں انسانی زندگی اور معاشرتی حقائق میں گہری ہوں۔ ایسا ادب محض اپنے وقت کا ترجمان نہیں رہتا بلکہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ بن جاتا ہے، جو نسلِ نو کے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتا ہے۔ پریم چند نے اپنے مجموعہ 'سوزِ وطن' کے دیباچے میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

"ہر قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفوں پر ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔"(۵)

ادب در حقیقت انسانی زندگی کا عکس اور عہدِ رواں کا ترجمان ہوتا ہے۔ شاعری ہو یا نثر، ہر صنفِ ادب اپنے دور کی تہذیبی اقدار، سماجی تضادات اور اخلاقی نشیب و فراز کی سچی داستان گو رہی ہے۔ ادب انسانی زندگی کا آئینہ اور اپنے عہد کا سچا ترجمان ہوتا ہے۔ اردو ناول کا ابتدائی دور بنیادی طور پر اخلاقی تربیت اور اصلاحِ معاشرہ سے وابستہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے 'مراۃ العروس' کے ذریعے خاندانی نظم و ضبط کی بنیاد رکھی، جبکہ مرزا ہادی رسوا نے 'امراؤ جان ادا' میں لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کی عکاسی کی۔ نوآبادیاتی دور میں ہونے والی شکست و ریخت کا نوحہ خواجہ حسن نظامی کے ہاں ملتا ہے، جبکہ علامہ راشد الخیری نے خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک اور سماجی زوال کو اپنا موضوع بنایا۔ وقت کے ساتھ اردو ناول کے کینوس میں وسعت آئی۔ عبداللہ حسین نے 'اداس نسلیں' اور شوکت صدیقی نے 'خدا کی بستی' کے ذریعے واضح کیا کہ اخلاقی زوال کا تعلق محض فرد سے نہیں بلکہ سیاسی سانحات اور معاشی استحصال سے بھی ہوتا ہے۔ یوں اردو ناول وعظ و نصیحت کی سطح سے بلند ہو کر تلخ سماجی حقائق اور طبقاتی ناہمواریوں کا عکاس بن گیا۔ جدید دور میں فرد کی داخلی دنیا اور شناخت کا مسئلہ مرکزی موضوع بن کر

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ابھرا۔ بانو قدسیہ نے 'راجہ گدھ' میں حلال و حرام کے تصور کو روحانی بقا کے لیے ناگزیر قرار دیا، جبکہ عصمت چغتائی نے 'ٹیڑھی لکیر' میں عورت کی نفسیاتی آزادی اور سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھائی۔ خدیجہ مستور کے ناول 'آنگن' نے تقسیم ہند کے پس منظر میں خاندانی نظام کے بکھراؤ کو بے نقاب کیا۔ قراۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں تاریخ کے وسیع تناظر میں تہذیبوں کے عروج و زوال اور تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے ثقافتی بحران کو بیان کر کے اردو ناول کو ایک نیا فکری وقار عطا کیا۔

تاریخی طور پر انسانی اخلاقیات کا سب سے بڑا زوال ہجرت اور تقسیم ہند کے وقت دیکھنے میں آیا، جہاں انسانی مجبوریوں کا بدترین استحصال کیا گیا۔ اس عہد کا ادب محض فکشن نہیں بلکہ ان تلخ حقائق کا نوحہ ہے جہاں انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ ناصر کاظمی، سعادت حسن منٹو، غلام عباس اور انتظار حسین جیسے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں اس سماجی انحطاط اور انسانیت کی تذلیل کو پوری شدت کے ساتھ قلمبند کیا۔ جدید دور کے ناول نگار اسی روایت کے پاسدار ہیں جو سماجی ناسوروں پر بے لاگ نشتر زنی کرتے ہیں۔ ان کے تخلیق کردہ کردار محض خیالی نقش نہیں، بلکہ اس اخلاقی دیوالیہ پن کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جو معاشرے کے چھپے ہوئے زخموں کو بے نقاب کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ برصغیر، اور بالخصوص پاکستانی معاشرہ، آج بھی چند بنیادی مسائل اور استحصالی ڈھانچوں کی جکڑبندیوں کا شکار ہے۔ ان معاشروں میں اخلاقی اقدار کا زوال کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ یہ صدیوں سے قائم جاگیردارانہ نظام کی پیدا کردہ تلخ حقیقت ہے۔ یہ نظام محض ایک معاشی ڈھانچہ نہیں، بلکہ ظلم، استحصال اور طبقاتی جبر کی وہ مشینری ہے جس نے انسانی حقوق اور سماجی مساوات کو پنپنے نہیں دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن اقوام اور معاشروں نے اس جاگیردارانہ شکنجے کو توڑا مثلاً چین اور روس جیسے ممالک انہوں نے ایک نئے سماجی و اقتصادی نظام کی بنیاد رکھی اور ترقی کی راہ ہموار کی۔ اس کے برعکس، پاکستان آج بھی اسی فرسودہ نظام کے اثرات تلے دبا ہوا ہے، جس کے کل پرزے ہر دور میں عوام کے استحصال کو یقینی بناتے ہیں۔ اسی جبر، اس کی تاریخی جڑوں اور معاشرتی بگاڑ میں اس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے علی عباس جلالپوری رقمطراز ہیں:

> "ہمارے ہاں جاگیر دار اور صنعت کار اعلیٰ طبقے میں شمار ہوتے ہیں اور تاجر مزارعہ (یوسف زئیوں کے علاقے مزارعین کو فقیر کہا جاتا ہے) اور اہل حرفہ کا مرتبہ کمتر ہے۔ اہل حرفہ کو کمین یا کمینہ (لغوی معنی کام کرنے والا) کہتے ہیں۔ ان میں لوہار، ترکھان، موچی، نائی، کمہار، ماچھی وغیرہ شامل ہیں۔" (۶)

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN(P): 2709-9636 | ISSN(O): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

آج کے دور میں دولت کا حصول انسانی زندگی کا واحد اور حتمی مقصد بن چکا ہے، جس کے آگے اخلاقیات اور اقدار کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ یہ مادیت پرستی مغرب کی صنعتی ترقی کا وہ تحفہ ہے جس نے ہمارے جذباتی اور سماجی رشتوں کے تقدس کو پامال کر دیا ہے۔ اب لوگ دولت کمانے کی اندھی دوڑ میں اس قدر مگن ہیں کہ انہیں برائی، برائی محسوس ہی نہیں ہوتی، جو کہ معاشرتی انحطاط کی ایک انتہائی المناک تصویر ہے۔ اسی مادیت زدہ ذہنیت کا سب سے دردناک پہلو 'اولڈ ہاؤسز' کا رواج ہے۔ جن والدین نے اپنی اولاد کو خونِ جگر سے سینچا، آج وہی اولاد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر انہیں اپنے ساتھ رکھنے کے بجائے اداروں کے حوالے کر رہی ہے۔ یہ اکیسویں صدی کی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جہاں بزرگ والدین اپنی آخری عمر میں جسمانی کرب سے زیادہ نفسیاتی تنہائی اور ہمدردی کی جھوٹی نظروں کی اذیت میں گھلنے پر مجبور ہیں۔ یہ رجحان ہماری مشرقی تہذیب کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا ہے اور خاندانی نظام کے انہدام کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے:

"بیسویں صدی سے اکیسویں صدی کے سفر میں جس انداز سے انسانی قدروں اور تہذیبوں کو شکست ہوئی ہے، وہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے تاریخ کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔" (۷)

نفسا نفسی کے اس دور میں خاندانی اقدار کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ آج کے مادہ پرست معاشرے میں اولاد والدین کو 'بوجھ' سمجھ کر اولڈ ہاؤسز میں چھوڑنے کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی اور عالمگیریت کے منفی اثرات نے ہماری تہذیبی روایات کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اب نجی زندگی کے فیصلے، بالخصوص شادی بیاہ کے معاملات، روایتی بندشوں سے آزاد ہو کر اخلاقی گراوٹ کی نذر ہو رہے ہیں۔ معاصر ناول نگاروں نے بڑے فنکارانہ انداز میں اس حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ کس طرح محبت کے نام پر جسمانی قربت اور پھر ذمہ داریوں سے انحراف، ایک نئی اور پیچیدہ معاشرتی الجھن بن چکا ہے۔ مزید یہ کہ نوجوان نسل ایک ایسے تاریک راستے پر گامزن ہے جہاں اخلاقیات کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کے سطحی رجحانات کی تقلید میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد فیشن اور فوری دولت کے حصول کے لیے جرائم کی دنیا میں قدم رکھ رہی ہے۔ غنڈہ گردی، لوٹ مار اور شریف شہریوں کی عزت و آبرو پر حملے ان کا وتیرہ بن چکا ہے۔ یہ نسل ایک ایسے گرداب میں پھنس چکی ہے جہاں سے واپسی کے راستے مسدود ہو رہے ہیں، اور یہ رجحان ہمارے معاشرے کے مستقبل کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے:

"اس دور میں لوگ ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے ان کی عزت کی حفاظت کرتے تھے، اب تو وہ اقدار ختم ہو چکی ہیں۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

> آج یہ حال ہے کہ اگر ساتھ والے مکان میں کوئی وقوعہ ہو جائے تو ہمسائے کو اس کی خبر نہیں۔" (۸)

اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے ہماری تہذیبی اقدار کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ آج کا باشعور ناول نگار طلسماتی کہانیوں سے نکل کر زندگی کی تلخ حقیقتوں، خاص طور پر جنس اور نفسیات کے پیچیدہ مسائل کو اپنا موضوع بنا رہا ہے۔ عالمگیریت کے زیر اثر جنسی جذبات پر قابو پانے کی اخلاقی صلاحیت دم توڑ چکی ہے، جس کے نتیجے میں حیا اور شرم کا تصور عنقا ہو گیا ہے۔ آج کے نوجوان نے اپنی جنسی تسکین کے لیے انسانیت اور اخلاقی حدود کو پاؤں تلے روند دیا ہے، جس کی واضح عکاسی معاصر ناولوں میں دکھائی دیتی ہے۔ دوسری جانب، جدید ٹیکنالوجی اور موبائل فون کی لت نے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا ہے۔ آج کا نوجوان جسمانی طور پر تو گھر میں موجود ہے، مگر ذہنی طور پر ڈیجیٹل دنیا (واٹس ایپ، فیس بک) میں اسیر ہے۔ اس ٹیکنالوجی نے انسان کو انسان سے بیگانہ کر دیا ہے، رشتوں کے تقدس اور بڑوں کی بات سننے کی روایت ختم ہو چکی ہے۔ یہ ڈیجیٹل سحر نہ صرف ہمیں نفسیاتی طور پر جکڑ رہا ہے بلکہ ہمیں اپنے خون کے رشتوں سے بھی دور کر رہا ہے۔ ادیبوں اور نقادوں نے بجا طور پر اس تشویشناک صورتحال کی نشاندہی کی ہے:

> "موبائل فون اور ٹی وی کا غلط استعمال جیسی ہیجان انگیزی، منشیات کی سودے بازی، بے حیائی اور حرام کاری کی طرف بڑھتے ہوئے قدم نمود و نمائش اور حرام خوری ایسے موضوعات ہمارے افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں بڑی شدت اور حقیقت کے ساتھ برت رہے ہیں۔"(۹)

موبائل فون اور ٹی وی اگرچہ جدید دور کی ناگزیر ایجادات ہیں مگر ان کے بے دریغ استعمال نے ہماری اخلاقی حدود کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ان آلات نے مرد و زن کے درمیان روایتی فاصلوں کو مٹا دیا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرتی اختلاط کو اب ایک عام اور غیر معیوب عمل سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ مغربی تہذیب کا وہ رُخ ہے جس نے ہماری نوجوان نسل کو جذباتی اور اخلاقی طور پر کمزور کر دیا ہے۔ ناول نگاروں نے معاشرے کی اسی بے رحم حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ کیسے ٹیکنالوجی اور اس کی اشتہاری مہمات نے نوجوانوں میں جنسی جذبات کے بے لگام اظہار کو فروغ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا سنگین معاشرتی مسئلہ ہے جہاں ٹیکنالوجی کے سحر میں مبتلا ہو کر ہم اپنی اقدار کھو رہے ہیں اور اخلاقی بگاڑ کو فیشن سمجھ کر قبول کر چکے ہیں: "اب اشیاء پیدا کر کے اس کی فروخت کے لئے تشہیری مہم

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

چلائی جاتی ہے اور صارف کی نفسیات اس مہم میں حدف بنائی جاتی ہے۔" [۱۰] جدید سائنسی ایجادات اور اشتہاری ثقافت نے انسانی نفسیات کو مادہ پرستی کی بھینٹ چڑھادیا ہے۔ کمپنیوں نے اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لیے نسوانیت کا جو استحصال شروع کیا، اس نے معاشرتی اور اخلاقی حدود کو دھندلا کر رکھ دیا ہے۔ آج کا ناول نگار اسی تلخ حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ کس طرح 'احساسِ گناہ' کے خاتمے نے برائی کو فیشن بنادیا ہے۔ نوجوان نسل، مغربی تہذیب اور ڈیجیٹل ہیجان کی دلدل میں پھنس کر اسلامی اخلاقیات اور روحانی شناخت سے دور ہو چکی ہے، جس کے نتیجے میں قناعت کی جگہ نفسیاتی امراض اور تنہائی نے لے لی ہے۔ مختصراً یہ کہ معاصر اردو ناول عالمگیریت (Globalization) کے ان منفی اثرات کا حساس مشاہدہ پیش کرتا ہے جنھوں نے انسانی رشتوں کے تقدس کو پامال کیا۔ ٹیکنالوجی اور مغربی آزادی کے سیلاب نے 'عالمی گاؤں (Global Village)' کے نام پر ہماری روایتی جفاکشی اور اخلاقی اقدار کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ آج کا ادیب ترقی اور جدت کے خوبصورت نقاب تلے چھپے ان تہذیبی زخموں کو بے نقاب کر رہا ہے جو ہماری نوجوان نسل کو بے راہ روی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عالمگیریت کا دائرہ کار تیزی سے وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ عالمگیریت (Globalization) محض ایک معاشی عمل نہیں، بلکہ اسے ایک عالمی سازش کا شاخسانہ بھی سمجھا جاتا ہے جس کا بنیادی مقصد علاقائی شناختوں کو مٹا کر مغربی تہذیب کا غلبہ قائم کرنا ہے۔ اگرچہ اس کے پہلو میں کچھ مثبت نتائج بھی موجود ہیں، جن میں سب سے نمایاں انسانی رابطوں میں آنے والی غیر معمولی وسعت اور آسانی ہے۔ آج کا انسان جدید مواصلاتی ذرائع کی بدولت دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنے پیغامات کو انتہائی کم وقت، کم خرچ اور سہولت کے ساتھ پہنچانے کے قابل ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سہولتیں، جو آج ہماری زندگی کا لازم و ملزوم حصہ بن چکی ہیں، ہمیشہ سے ایسی نہیں تھیں۔ ماضی قریب تک حالات اس سے یکسر مختلف تھے اور ایک پیغام یا سفر کے لیے ہفتوں اور مہینوں درکار ہوتے تھے: "نیو یارک سے لندن تین منٹ کی کال ایک ڈالر میں پڑتی ہے جبکہ انیس سو تیس میں یہ کال تین سو ڈالر میں پڑتی تھی۔" [۱۱] مختصراً یہ کہ عالمگیریت نے رابطوں کو انتہائی سہل بنادیا ہے۔ آج ویڈیو کالز اور جدید ٹیکنالوجی کی بدولت دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھا فرد دوسرے سے ایسے جڑ گیا ہے جیسے وہ سامنے موجود ہو۔ اس کے علاوہ، عالمی تعاون کے باعث خوراک کی ترسیل میں آسانی پیدا ہوئی ہے، جس سے دنیا بھر میں غذائی قلت کے مسائل پر قابو پانا ممکن ہوا ہے۔ ساتھ ہی انٹرنیٹ نے علمی و تہذیبی تبادلے کے دروازے کھول دیے ہیں، جہاں اب کتب اور معلومات تک رسائی محض چند کلکس کی دوری پر ہے۔ تاہم، ان تمام تکنیکی اور معاشی فوائد کے باوجود،

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

عالمگیریت کے نقصانات اس کے فوائد پر بھاری ہیں۔ یہ نظام جہاں سہولتیں لایا ہے، وہیں مقامی ثقافتوں کے خاتمے، اخلاقی انحطاط اور معاشرتی بحرانوں کا سبب بھی بن رہا ہے۔

عالمگیریت (Globalization) کے زیرِ اثر تشکیل پانے والا موجودہ معاشرہ مسلسل تبدیلیوں کی زد میں ہے، جہاں ہر گزرتا دن مشرقی روایات کو قصہ پارینہ بنا رہا ہے۔ ادیب جو معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے وہ مغربی تہذیب کے غلبے اور مشرقی اقدار کے زوال کو بخوبی محسوس کر رہا ہے۔ اکیسویں صدی کا اردو ناول اسی تہذیبی بحران اور سماجی انتشار کا شفاف آئینہ دار ہے۔ آج کا ناول نگار محض قصہ گوئی تک محدود نہیں، بلکہ وہ پاکستانی معاشرے کی ٹوٹتی ہوئی ساخت، خاندانی نظام کے بکھراؤ، شناخت کے بحران اور طاقت کی سیاست جیسے پیچیدہ موضوعات کو اپنا محور بنا رہا ہے۔ اس عہد کے ادب میں فرد کی تنہائی، معاشی ناہمواری اور دہشت گردی کے نفسیاتی اثرات کو جس بے باکی سے پیش کیا گیا ہے، وہ ہمارے عہد کی ایک مکمل دستاویزی تاریخ ہے۔ مرزا اطہر بیگ، علی اکبر ناطق، آمنہ مفتی، آغا گل، سید کاشف رضا اور زیف سید، طاہرہ اقبال جیسے معاصر قلم کاروں نے اپنے فن کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اردو ناول اب صرف تفریح کا سامان نہیں رہا، بلکہ یہ ہمارے عہد کے سماجی و نفسیاتی ارتقا کو سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔

مرزا اطہر بیگ کے ناول میں 'ثناء اللہ' کا کردار دیہی معاشرے میں دم توڑتی اقدار اور ذات پات کے فرسودہ نظام کا ایک المناک استعارہ ہے۔ یہ کردار اس معاشرتی جبر کی عکاسی کرتا ہے جہاں خاندانی وقار کے مصنوعی بت انسانی جذبات پر مقدم کر دیے جاتے ہیں۔ ایک طرف 'ذکی' جدیدیت کا نمائندہ ہے، تو دوسری طرف ثناء اللہ ہے، جس کی محرومیوں اور والدین کی بے رخی نے اسے بغاوت پر آمادہ کیا۔ جب اس نے برادری سے باہر نکاح کی خواہش کی، تو اسے محض ایک انسانی حق کے بجائے "ذات پات" کی توہین قرار دے کر 'خاندانی غیرت' کے نام پر اس کی شخصیت کو کچل دیا گیا۔ المیہ تب شدت اختیار کرتا ہے جب سماجی جبر کا شکار ثناء اللہ، انتقام کی آگ میں جل کر خود ایک بے رحم ظالم بن جاتا ہے۔ اس کا خواتین کے ساتھ ناروا سلوک اور نکاح کے تقدس کی پامالی ثابت کرتی ہے کہ جب معاشرہ کسی فرد سے اس کی جائز خوشیاں چھین لیتا ہے، تو اس کے اندر سے صلہ رحمی اور وفا کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اس نظام کا بدلہ ان بے گناہ عورتوں سے لیتا ہے جن کا اس کے دکھوں میں کوئی حصہ نہ تھا۔ دراصل، یہ کردار اس اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے جہاں نظامِ جبر مظلوم کو بھی ایک شکاری میں بدل دیتا ہے، اور انسانیت اپنی ہی خود ساختہ اقدار کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

"ہوا اصل میں یہ کہ۔۔۔میں بات مختصر کروں گا۔۔۔کہ بھائی ثنااللہ عنفوان شباب سے بھی کچھ پہلے ہی گاؤں کے مصلی جاموں کی بیٹی سنگو کے عشق میں گرفتار ہو کر اُس سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی ضد کرنے لگے۔ والد صاحب سالار برادری کے منشی ہونے کے باوجود مصلیوں کی بیٹی کو بہو بنانے کی ذلت کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔"(۱۲)

مرزا اطہر بیگ کا یہ بیانیہ ذات پات اور "غیرت" کے نام پر انسانی جذبات کے قتل اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے انتقامی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جب سماج ثناء اللہ جیسے فرد سے اس کا جائز حق چھین لیتا ہے، تو وہ محرومی کا بدلہ بے گناہ عورتوں سے لے کر خود مظلوم سے ظالم بن جاتا ہے۔ یہ کردار ثابت کرتا ہے کہ نظام کی بے حسی انسان کے اندر سے صلہ رحمی اور احترامِ نسواں جیسے جذبات ختم کر کے اسے اخلاقی دیوالیہ پن کی اس نہج پر لے آتی ہے جہاں وہ اپنی تسکین کے لیے دوسروں کی زندگیاں برباد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

جہاں مرزا اطہر بیگ نے طبقاتی جبر کے نتیجے میں فرد کے اندر پیدا ہونے والی اخلاقی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے، وہیں علی اکبر ناطق کے فکری تناظر میں 'ولیم' کا کردار ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی اُس 'احسان فراموشی' کو بے نقاب کرتا ہے، جو ایک باشعور اور خدمت گزار فرد کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے۔ جس شخص نے اپنی زندگی تعلیم اور زرعی اصلاحات کے لیے وقف کی، ریاست اور بیوروکریسی نے اس کے بدلے اسے شہریت اور بنیادی حقوق کے لیے دربدر کر کے اپنے اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا۔ ولیم کا بڑھاپا ایک جھونپڑی میں گزرنا اور بے بسی کی حالت میں دم توڑنا، اس سماجی بے حسی کا عکاس ہے جہاں حکومتی اور امراء کے طبقے نے انسانی خدمات کو پسِ پشت ڈال کر صرف کاغذات اور عہدوں کو اہمیت دی ہے۔ ولیم کے آخری وقت میں صرف غریب مزارعین کا اس کے پاس ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے انسانیت ختم ہو چکی ہے، اور قدروں کی آخری رمق صرف پسے ہوئے طبقے میں باقی ہے۔ یہ کردار اس معاشرتی زوال کا نوحہ ہے جہاں محسنوں کو حقیر جان کر کسمپرسی میں چھوڑ دینا ایک معمول بن چکا ہے:

"اس معاملے میں اشرافیہ تو ایک طرف، مدت ہوئی، اُس کے اپنے بیوی بچوں نے بھی اُسے بالکل بھلا دیا تھا۔پہلے پہل انہوں نے دو تین چکر لگائے اور ولیم کو بھی سرسری انگلستان جانے کا مشورہ دیا لیکن جب ولیم نے سختی سے اس بات کو رد کر دیا تو وہ آہستہ

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

آہستہ اسے بھولنے لگے اور اب نوبت یہاں تک آگئی کہ ولیم کے خطوں کا جواب بھی نہیں دیتے تھے ایک آدھ بار جواب دیا بھی، تو وہ ایک دو سطر میں ایسا سر سری تھا، جسے خط کے نام پر مذاق کہہ لینا چاہیے۔"(۱۳)

علی اکبر ناطق کا یہ بیانیہ خاندانی اقدار کی شکست اور مادہ پرستی کے عروج کی ایک المناک مثال ہے، جہاں ولیم کا اپنے کام سے لگاؤ اس کے اپنوں کے لیے بیگانگی کا باعث بن گیا۔ بیوی بچوں کا اسے کسمپرسی میں چھوڑ کر انگلستان چلے جانا اس جدید مادی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جہاں ذاتی مفادات خون کے رشتوں پر غالب آ چکے ہیں۔ ولیم کا جھونپڑی میں لاوارث مر جانا خاندانی ہمدردی کے خاتمے کا نوحہ ہے، جو ثابت کرتا ہے کہ جب رشتوں کے تقدس پر مادی آسائش کو فوقیت دی جائے تو معاشرہ اخلاقی طور پر بانجھ ہو جاتا ہے۔

خاندانی رشتوں کی اس بے حسی اور مادہ پرستی کا یہ زہر صرف گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتا، بلکہ آغا گل کے بیانیے میں یہ زوال مزید وسعت اختیار کر کے دوستی کے تقدس، سماجی دیانت اور انسانی جان کی حرمت جیسے بنیادی اخلاقی ستونوں کو بھی گرا دیتا ہے۔ آغا گل کا یہ بیانیہ دوستی کے تقدس، انسانی جان کی حرمت اور اخلاقی دیانت کے زوال کی ایک نہایت کربناک تصویر ہے۔ اس کہانی میں نجیب، رخسانہ اور قاضی کے کردار اس باطنی پستی کو نمایاں کرتے ہیں جہاں ذاتی خواہشات اور مادی مفادات کے سامنے برسوں کی رفاقت اور اخلاقی حدود دم توڑ جاتی ہیں۔ یہاں اقدار کا زوال دو رُخوں سے عیاں ہے ایک طرف نجیب کا کردار ہے، جو دوستی جیسے مقدس رشتے کو ایک عورت کی خاطر قربان کر کے اعتماد کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ دوسری طرف رخسانہ کا کردار ہے، جو غربت اور آسائش کی ہوس میں اخلاقی پستی کی آخری حدوں کو چھو لیتی ہے۔ شوہر کے جبر کا جواب قتل اور مسلسل مجرمانہ زندگی سے دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں ضمیر کی آواز مکمل طور پر خاموش ہو چکی ہے۔ نجیب کا ایسی قاتلہ کو معاف کر دینا اس کی شرافت نہیں بلکہ اس اخلاقی اندھے پن کی علامت ہے، جہاں صحیح اور غلط کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ یہ کردار یہ واضح کرتے ہیں کہ جب معاشرے میں دیانت، وفا اور انسانی جان کا احترام ختم ہو جائے، تو انسان اپنی انا اور ضرورت کی تکمیل کے لیے کسی بھی تاریک حد تک گر سکتا ہے، جہاں اخلاقیات محض ایک لفظ بن کر رہ جاتی ہیں:

"نجیب مفت میں بلائینڈ کر رہا تھا۔ شاید قاضی کی خاطر یا شاید رخسانہ کے لیے، وہ فیصلہ نہ کر سکا، جو بھی فوٹو گرافی ہوتی۔ نجیب نہایت ہی خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈبل پرنٹ بنواتا۔ رخسانہ کی تصویریں رکھ کر باقی سبھی تصویریں اور نیگیٹو وہ قاضی کے حوالے کر دیا

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

> کرتا۔ ایک بار اس نے رخسانہ کی تصویر مانگی تو قاضی چونک اٹھا۔ کیا کرو گے، بھابھی تو بہن سمان ہوا کرتی ہے۔ تمہارے پاس کیا البم ہیں۔ لالچ بری بلا ہے۔"(۱۴)

آغا گل کا یہ بیانیہ دوستی کے تقدس، سماجی اخلاقیات اور انسانی وفاداری کے زوال کی ایک کربناک تصویر ہے، جہاں نجیب، قاضی اور رخسانہ کے کردار ذاتی مفادات کے لیے اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہیں۔ نجیب کا دوستی میں خیانت کرنا اور رخسانہ کا مادی ہوس یا جبر کے ردعمل میں شوہر کو زہر دے کر مارنا، انسانی جان کی حرمت اور قانون کے خاتمے کا ثبوت ہے۔ جب نکاح اور رفاقت جیسے مقدس رشتے محض جسمانی ضرورت یا مادی فائدے کا ذریعہ بن جائیں، تو یہ معاشرے کے اجتماعی ضمیر کے مردہ ہو جانے کی نشانی ہے۔ یہ کردار ثابت کرتے ہیں کہ حیا اور امانت داری کے بغیر ہر رشتہ محض دھوکے اور بے وفائی کا کھیل بن کر رہ جاتا ہے۔

آغا گل کے بیانیے میں دوستی اور انسانی جان کی حرمت کے اس المناک زوال کے بعد، سید کاشف رضا کا ناول اس اخلاقی گراوٹ کو 'ازدواجی وفاداری' اور 'نکاح کے مقدس بندھن' کے دائرے میں لا کر، خاندانی نظام کی بنیادی شکست و ریخت کو موضوع بناتا ہے۔ سید کاشف رضا کے اس بیانیے میں زرینہ اور جاوید کے کردار ازدواجی وفاداری اور نسائی تقدس کے زوال کی ایک ہولناک تصویر پیش کرتے ہیں۔ نکاح جیسا مقدس عہد جو معاشرے میں وفاداری اور اعتماد کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، یہاں نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ زرینہ کا ایک شادی شدہ عورت ہونے کے باوجود غیر مرد کے پاس جانا اور محض وقتی لذت کی خاطر اپنے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا، اس اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت ہے جہاں حیا اور خاندانی وقار کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اقدار کی اصل پستی اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب عارضی جنسی تسکین اور جھوٹی تسلیوں کو سماجی عزت اور مستقل رشتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ صورتحال ثابت کرتی ہے کہ جب فرد کے اندر سے خوفِ خدا، شرم و حیا اور نکاح کی حرمت کا احساس ختم ہو جائے، تو وہ اپنی جبلتوں کا قیدی بن کر نہ صرف اپنی شرافت کھو دیتا ہے بلکہ پورے خاندانی ڈھانچے کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ یہ اقتباس دراصل اس جدید مادہ پرست سوچ پر ضرب ہے جہاں انسانی اقدار جسمانی ضرورتوں کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی ہیں:

> "فرینڈ شپ کرنا چاہتے ہو؟" زرینہ نے کہا اور جب دیکھا کہ کچھ لمحوں تک جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا تو اپنا رُخ اس کی طرف پھیر کر یہی سوال اپنی آنکھوں سے پوچھا۔ جاوید سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ زرینہ نے یکایک اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔" چلو آج

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

سے ہم تم فرینڈ۔ ٹھیک ہے؟" وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی اور اس کے نرم ہاتھ کی ملائمت جاوید کے وجود میں سرایت کر گئی۔"[۱۵]

زرینہ اور جاوید کے رویوں کے ذریعے یہ اقتباس معاشرتی اور نسائی اقدار کے خاتمے کی ایک لرزہ خیز تصویر پیش کرتا ہے، جہاں زرینہ تمام مذہبی و سماجی حدود کو توڑ کر اخلاقی پستی کا انتخاب کرتی ہے۔ یہاں اقدار کا زوال تب واضح ہوتا ہے جب زرینہ اور جاوید نفسانی خواہشات کی خاطر نکاح کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے "دوستی" کے پاکیزہ لفظ کو اپنے ناجائز تعلقات کے لیے ڈھال بناتے ہیں۔ جاوید کا اس عمل میں شریک ہونا اور زرینہ کا اپنی ازدواجی حیثیت کو فراموش کرنا ثابت کرتا ہے کہ شرم و حیا کے بغیر انسان اپنی جبلتوں کا غلام بن جاتا ہے۔ یہ صورتحال اس مقتول ضمیر کی عکاسی ہے جو انسان کو حیوانیت کی سطح پر گرنے سے روکنے میں ناکام ہو چکا ہے۔

سیّد کاشف رضا کے ہاں جہاں اخلاقی زوال کا محور 'نسائی وقار اور ازدواجی وفاداری' کا فقدان ہے، وہیں آمنہ مفتی کا بیانیہ اس اخلاقی پستی کو ایک قدم آگے لے جا کر 'خونی رشتوں' اور 'جائیداد کی ہوس' جیسے خاندانی المیے کی صورت میں پیش کرتا ہے، جو معاشرے کے اجتماعی ڈھانچے کو اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے۔ آمنہ مفتی کے اس بیانیے میں اللہ یار، محسن اور اسرار کے کرداروں کے ذریعے خونی رشتوں کی پامالی اور جائیداد کی ہوس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اخلاقی زوال کی ایک لرزہ خیز تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہاں اقدار کی پستی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچتی ہے جب بھائی جیسا مقدس رشتہ، جو تحفظ اور طاقت کی علامت ہونا چاہیے تھا، مادی مفادات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ محسن کا محض زمین کے ٹکڑے کی خاطر اپنے سگے بھائی اسرار کے خلاف سازش کرنا اس اخلاقی دیوالیہ پن کو ظاہر کرتا ہے جہاں انسان کے نزدیک زمین کی قیمت انسانی جان اور خون کے رشتے سے بڑھ گئی ہے۔ مزید برآں، معاشرے کا رویہ بھی اس زوال میں برابر کا شریک نظر آتا ہے جہاں اللہ یار کی موت پر ہمدردی کے بجائے اسرار کو موردِ الزام ٹھہرانا اور اسے منحوس قرار دینا سماجی بے حسی اور توہم پرستی کا ثبوت ہے۔ جب ایک بیٹا باپ کے سوگ کے بجائے جائیداد پر قبضے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو، تو یہ اس خاندانی اور تہذیبی ڈھانچے کی مکمل تباہی کا اشتہار ہے جس پر ہمارا معاشرہ کھڑا تھا۔ یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ اقدار کا حقیقی زوال تب ہوتا ہے جب جائیداد کی ہوس انسان کو اتنا اندھا کر دے کہ اسے اپنے سگے بھائی کا لہو بھی نظر نہ آئے اور وہ دوسروں کی بربادی میں اپنی کامیابی تلاش کرنے لگے:

" وہ پلنگ پر پڑا پڑا قہقہے لگایا کرتا تھا اپنی فتح اور اسرار کے فرار پہ۔ اسے یہ سوچ کر بھی بہت خوشی ہوتی تھی کہ آج اسرار ان ہی بھوریوں میں پناہ گزین ہے، جن کو ختم کرنا اس کا

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

منصوبہ تھا۔ یہاں آ کر وہ پھر میاں اللہ یار کی ماں بہن کو چیدہ چیدہ گالیوں سے نوازتا کہ اتنا روپیہ ہونے کے بعد اسے بھوریوں کو آباد کرنے کی کیا موت پڑی تھی؟ پھر وہ بیٹے کی موت پہ کچھ افسردہ ہوتا، لیکن یہ سوچ کر صبر کر لیتا کہ اچھا ہوا، راہ کا ایک کانٹا اور کم ہوا۔ اس نے آگے نہ کبھی سوچا اور نہ وہ سوچنا چاہتا تھا۔" (۱۶)

آمنہ مفتی کا یہ بیانیہ بھائیوں کے رشتے میں ہوس اور سنگدلی کے ذریعے معاشرتی اقدار کے بگاڑ کی ایک ہولناک تصویر ہے، جہاں محسن جیسا بھائی جائیداد کی خاطر اپنے سگے بھائی کی زندگی اور تکلیف سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ صورتحال اس اخلاقی دیوالیہ پن کی عکاس ہے جہاں مادی اشیاء کی قدر انسانی خون اور جذباتی رشتوں سے بڑھ چکی ہے۔ اقدار کی اصل پستی تب نمایاں ہوتی ہے جب محسن کسی قریبی عزیز کی موت پر غمزدہ ہونے کے بجائے اسے اپنے مالی فائدے کے ترازو میں تول کر اطمینان محسوس کرتا ہے۔ یہ اقتباس ثابت کرتا ہے کہ معاشرتی زوال اس نہج پر ہے جہاں موت کا دکھ بھی لالچ کے سامنے ہیچ ہو گیا ہے اور محافظ ہی مٹنے کا منتظر ہے۔

آمنہ مفتی کے ہاں جہاں مادی ہوس کا شکار 'خونی رشتے' اور 'جائیداد' ہیں، وہیں زیف سیّد کا بیانیہ اس مادہ پرست سوچ کی ہولناکی کو ایک اور سطح پر لے جاتا ہے، جہاں 'عورت کے بنیادی حقوق' اور 'انسانی جان' کی قیمت بھی اسی مادی ہوس کی نذر ہو جاتی ہے۔ زیف سیّد کے اس بیانیے میں گل مینہ اور ملک عطا اللہ کے کرداروں کے ذریعے قبائلی معاشرت میں انسانی حقوق کی پامالی اور اخلاقی اقدار کے زوال کی ایک لرزہ خیز تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ ناول اس تلخ حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ "ترقی یافتہ دور" کے دعوؤں کے باوجود آج بھی عورت کو وراثت اور مرضی کے نکاح جیسے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اقدار کا اصل زوال تب نمایاں ہوتا ہے جب "دلور" جیسی جاہلانہ رسومات کے نام پر لڑکیوں کو پیسوں کے عوض فروخت کیا جاتا ہے۔ گل مینہ کے بھائیوں کا محض چند روپوں کے بدلے اسے ایک بوڑھے شخص کے حوالے کر دینا اس وحشیانہ سوچ کی عکاسی ہے جہاں مادہ پرستی نے رشتوں کے تقدس اور بہن کی ممتا کو پامال کر دیا ہے۔ ملک عطا اللہ کا کردار اس سماجی فرعونیت اور اخلاقی پستی کا ثبوت ہے جو اپنے اثر و رسوخ کے بل بوتے پر معصوم جانوں کا سودا کرتا ہے اور تعلیم و اصلاح کی کوشش کرنے والوں کو خوفزدہ کر کے نظام سے دور کر دیتا ہے۔ دوسری طرف، گل مینہ کی بغاوت اس گھٹن زدہ معاشرے کے خلاف ایک نوحہ ہے جو عورت کو "انسان" کے بجائے "مال و اسباب" گردانتا ہے۔ یہ پوری صورتحال اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ جس

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

ماخذ تحقیقی مجلہ

معاشرے میں عدل، شفقت اور انسانی تکریم کی جگہ بیٹیوں کی خرید و فروخت لے لے، وہاں سے حیا اور تہذیب رخصت ہو جاتی ہے، اور یہی ہمارے اجتماعی ضمیر کے مردہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے:

> "پتہ نہیں قصور کس کا تھا۔ بڑے بھائی کا جو پچاس ہزار روپے لے کر اسے اگلے جمعے بڑھے کھوسٹ ملک عطا اللہ جان کے کھونٹے سے باندھنا چاہ رہے تھے، جس کے چند بچے کھچے دانت نسوار کھا کھا پیلے پڑ گئے تھے، اور جو ہنستا تھا تو لگتا ہے کہ کھانس رہا ہے اور جب کھانستا تھا تو لگتا تھا ہنس رہا ہے۔ ساری زندگی ملکیانی بن کر راج کرے گی، راج، سب یہی کہتے تھے۔ لیکن وہ خود سے بڑی عمر کے بیٹوں اور بیٹیوں کی اماں بن کر راج نہیں کرنا چاہتی تھی۔"(۱۷)

زیف سید کا یہ بیانیہ قبائلی جاہلیت اور نسائی حقوق کی پامالی کی سنگین تصویر ہے، جہاں سگے بھائی اپنی بہن کو مادی لالچ کی خاطر محض چند ہزار روپوں کے عوض فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ عمل اس اخلاقی دیوالیہ پن کی انتہا ہے جہاں انسانی رشتوں پر مادی مفادات غالب آ چکے ہیں اور ایک جیتے جاگتے انسان کو "بکاؤ مال" سمجھ لیا گیا ہے۔ بیٹیوں کو پیسوں کی خاطر بوڑھے مردوں کے ہاتھ بیچنا نہ صرف عورت کی تذلیل ہے بلکہ اس سماجی بے حسی کا ثبوت ہے جہاں غیرت کے کھوکھلے دعوؤں میں انسانی تکریم کا کوئی وجود نہیں۔ یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ جاہلانہ رسوم و رواج نے مذہبی و انسانی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر کمزور کے استحصال کو ایک معمول بنا دیا ہے۔

زیف سیّد کے بیانیے میں جہاں قبائلی جبر کے ذریعے عورت کے بنیادی انسانی حقوق کو مادی قیمت پر بیچا جاتا ہے، وہیں طاہرہ اقبال کا ناول اس مادہ پرستی کو ایک اور رُخ سے بے نقاب کرتا ہے، جہاں 'جھوٹی نمود و نمائش' اور 'دکھاوے' کی ہوس میں جذباتی رشتوں کا تقدس اور محسنوں کی قربانیوں کا صلہ بھی مٹی میں ملایا جا رہا ہے۔ طاہرہ اقبال کا یہ بیانیہ مادہ پرستی اور نمود و نمائش کے باعث دم توڑتی اخلاقی قدروں کا ایک نوحہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں کبھی سادگی، قناعت اور اپنوں کی محنت کا احترام بنیادی اقدار ہوا کرتی تھیں، مگر ڈالروں کی ہوس نے ان رشتوں کو مادی مفادات میں بدل دیا ہے۔ اقدار کا زوال تب واضح ہوتا ہے جب ایک شخص کی پردیس میں خون پسینے کی کمائی کو خاندان والے صرف "ولایتی" کہلوانے اور مہنگے برانڈز (گھڑیوں، چشموں اور گاڑیوں) پر اُڑانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ رویہ اس احسان فراموشی کی علامت ہے جہاں انسان مادی چمک دمک کے سامنے اپنوں کی تکالیف سے اندھا ہو چکا ہے۔ اقدار کی اصل پستی اس "جھوٹی شان و شوکت" میں نہاں ہے، جہاں انسان کی پہچان اس کے کردار

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10
ماخذ تحقیقی مجلہ

کے بجائے اس کے امپورٹڈ لباس، مہنگے ریستورانوں اور عالی شان کوٹھیوں سے کی جانے لگی ہے۔ جب معاشرے میں نمود و نمائش کو معیارِ زندگی بنالیا جائے، تو یہ تہذیبی دیوالیہ پن کی نشانی ہے۔ یہ اقتباس ہمیں بتاتا ہے کہ اقدار کا حقیقی زوال دراصل اس ہوس کا نام ہے جس میں ہم دوسروں سے برتر نظر آنے کے چکر میں اپنے محسنوں کے کرب کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ مادہ پرستی محض روپے پیسے کا زیاں نہیں، بلکہ ان جذباتی رشتوں کا قتل ہے جو کبھی ہمدردی اور ایثار کی بنیاد پر قائم تھے:

> "جس گھر کی تعمیر کے لیے اس نے سالوں پٹرول پیا اور ٹیکسی کے ٹائروں سے چھٹتی دھول پھانکی ہو۔ اکلاپے کی راتوں کو اس شیش محل کے تصورات سے سجایا ہو۔ جس کے مکیں جدید آسائشوں کے عادی ہو چکے ہوں، جو نئی نئی دولت کی خیر گی میں خود کو ایلیٹ کلاس کہتے ہوں۔ وہ اس مزدور شکل، ان پڑھ اُجڈ دیہاتی کو گھر کا سربراہ بنا کر کیسے متعارف کرواسکتے ہیں، جو اس گھرانے کا سودا سلف لانے والا بابا تو ہو سکتا ہے، فرد نہیں۔۔۔وہ تو اسی سن میں اسی مالی حیثیت میں اس ذہنی سماجی کیفیت کے قالب میں مقید ہو چکا تھا۔"(۱۸)

طاہرہ اقبال کا یہ بیانیہ پردیس میں بسنے والے شخص کی قربانیوں اور اس کے بدلے میں اپنوں کی سرد مہری کے ذریعے معاشرتی بے حسی کی عکاسی کرتا ہے، جہاں خاندان کی خاطر اپنی جوانی تپتی دھوپ کی نذر کرنے والے کو واپسی پر وہ مقام نہیں ملتا جس کا وہ حقدار ہے۔ اقدار کا زوال تب نمایاں ہوتا ہے جب وہی خاندان جس کی پرورش اس شخص کے خون پسینے سے ہوئی، اسے اس کے سادہ حلیے کی بنیاد پر دوسروں سے متعارف کرواتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے۔ یہ مادہ پرست سوچ کا شاخسانہ ہے جہاں انسان کی قدر اس کی قربانیوں کے بجائے جدید سماجی معیار اور ظاہری چمک دمک سے لگائی جاتی ہے۔ جب رشتے محض "رقم کے حصول کا ذریعہ" بن جائیں، تو انسانیت، مروت اور خاندانی تعلقات جھوٹی شان و شوکت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ادب اور اخلاق کا رشتہ انسانی تہذیب کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ اردو فکشن کے کرداروں نجیب، قاضی، رخسانہ، زرینہ، محسن اور گل مینہ کا مطالعہ محض افسانوی کرداروں کا احوال نہیں، بلکہ یہ اس اجتماعی المیے کی نقاب کشائی ہے جس سے آج کا معاشرہ دوچار ہے۔ جب کسی سماج میں خونی رشتوں کا تقدس، نکاح جیسی مقدس بندھنوں کی حرمت اور ایثار جیسی اعلیٰ اقدار، مادی ہوس اور جھوٹی شان و شوکت کے تلے دب جائیں، تو وہ معاشرہ اپنی شناخت اور اخلاقی بنیادیں کھو دیتا ہے۔ ادب ان تمام تلخ

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

حقائق کو محض ایک بیانیے کے طور پر پیش نہیں کرتا، بلکہ یہ ایک کڑے محاسبے کی مانند ہے۔ یہ کردار یہ ثابت کرتے ہیں کہ جب انسان کے اندر سے خوفِ خدا اور شرم و حیا کا پہرہ ہٹ جائے، تو وہ اپنی جبلتوں کا غلام بن کر حیوانیت کی سطح پر آ گرتا ہے۔ اس مطالعے کا حتمی نتیجہ یہ ہے کہ ادب کا اصل فریضہ صرف سماجی بگاڑ کی نشاندہی کرنا نہیں، بلکہ اسے بدلتی ہوئی اقدار کے آئینے میں اپنی اخلاقی سمت کا تعین کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل تبھی ممکن ہے جب ہم ادب کے دیے ہوئے ان انتباہی اشاروں کو سمجھیں اور اپنی اجتماعی اخلاقیات کو دوبارہ انسانیت، دیانت، اور ہمدردی کی بنیادوں پر استوار کریں۔

حوالہ جات

۱۔ راجہ شکیل انجم، ادب زندگی ہے، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار (تنقیدی مطالعہ)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱

۳۔ خاور جمیل، نئی تنقید، رائل بک کمپنی کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۰

۴۔ صدیق احمد، پروفیسر، ادب اور زندگی (مجنوں گورکھپوری کے چند تنقیدات کا مجموعہ)، اردو گھر علی گڑھ، ایوان گورکھپور، ۱۹۸۴ء، ص ۴۷

۵۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۷

۶۔ علی عباس جلالپوری، رسوم اقوام، تخلیقات، لاہور، ۱۰ اگست ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۵

۷۔ عشرت رحمانی، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، جاودان پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۹۲

۸۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانہ کے رجحانات، انجمن ترقی ادارہ پاکستان، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۴۲۲

۹۔ شہاب ظفر اعظمی، ہم عصر افسانے کا فکری سروکار (مضمون)، مطبوعہ: اردو ریسرچ جنرل، شمارہ پانچ، اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۲۰

۱۰۔ سیّد عامر سہیل، ڈاکٹر، احمد عبداللہ، عالمگیریت؛ تناظرات و امکانات (مضمون)، مطبوعہ معیار، شمارہ ۹، ص ۱۲۳

۱۱۔ عالمگیریت کیا ہے www.bbc.com/urdu، ۱۶ مارچ ۲۰۲۶ء، ۱۵:۱۲

۱۲۔ مرزا اطہر بیگ، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۳

۱۳۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۳۹۱

۱۴۔ آغا گل، دشتِ وفا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۴۰

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-10

۱۵۔کاشف رضا، سیّد، چار درویش اور ایک کچھوا، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۶۲

۱۶۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، الفصیل ناشران و تاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، ص ۱۲۷

۱۷۔زیف سیّد، گل مینہ، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۸

۱۸۔طاہرہ اقبال، گراں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۲۴۱